مستشرقین کی علمی تحقیقات اوران کے مقاصد

مولانا عمیر الصدیق ندوی

میری آج کی گفتگو کے دو پہلو ہیں، ایک تو مستشرقین کی علمی تحقیقات اور دوسرے ان کے اصل مقاصد، دیکھا جائے تو یہ دونوں پہلو اصلاً ایک ہی ہیں۔ مستشرقین کی علمی تحقیقات دراصل ان کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہیں۔ اس لئے تحقیقات اور مقاصد میں معنوی طور پر کوئی فرق نہیں۔

یہاں اولاً خود مستشرق اور استشراق کی تعریف کی ضرورت ہے، لیکن اب یہ طبقہ اس درجہ معروف ہے کہ آپ حضرات کے سامنے یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ اصطلاح مغرب کے ان اہلِ تحقیق کے لئے خاص ہے جنہوں نے مشرقی علوم وفنون، زبان وادب اور تہذیب وثقافت جس میں مذہب بھی شامل ہے کو اپنی دلچسپی کا موضوع بنایا اور ان کا خصوصی مطالعہ کر کے براہ راست ان سے واقفیت حاصل کی۔

ایک سوال یہ بھی سامنے آتا ہے کہ استشراق کی ابتداء کب اور کن حالات میں ہوئی؟ اب اصطلاحی مستشرقین کی تاریخ دیکھی جائے تو محققین کے مطابق اس طبقہ کے کئی ادوار سامنے آتے ہیں۔ مثلاً ایک دور تو وہ ہے جب اسپین اور سسلی کی سرزمین پر عربوں نے پہلا قدم رکھا۔ اسپین میں عربوں کی آمد سب جانتے ہیں کہ تہذیب اور علوم وفنون کے ایک نئے اور انقلاب آفرین دور کی شروعات تھی۔ عربوں یعنی مسلمانوں کی علمی سربلندی کا راز دریافت کرنے کا جذبہ اور خود اسلام کی حقیقت کو سمجھنے کی خواہش اس وقت کے اسپینی اور وسیع پیمانے پر پورے یورپ کے عیسائیوں میں پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ چنانچہ بارہویں صدی عیسوی میں طیطلہ کے ڈریمورنڈ ابراہیم بن عذراء، گیرررڈی کریمونا، ایڈی لرڈ، ڈینٹل آف مارلے، میکل اسکاف وغیرہ ایسے نام ملتے ہیں جنہوں نے اسلامی علوم کی کتابوں کو اپنی زبانوں میں منتقل کیا۔

اس کے بعد وہ زمانہ آتا ہے جس کے متعلق ہمارے محققین نے لکھا کہ یہ صلیبی جنگوں کے بعد کا دور ہے۔ علامہ شبلی نے اس دور کے مستشرقین کی علمی دلچسپیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ”یورپ کی فیاض دلی قابلِ رشک ہے کہ ایک

طرف تو مذہبی اختلافات کی بناء پر مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا لیکن دوسری طرف اس نے بے تکلف مسلمانوں کے خوانِ کرم سے زلہ رُبائی شروع کردی۔ اس دَور کی خصوصیت یہ ہے کہ اب مستشرقین کے طرزِ فکر اور اندازِ تحقیق میں بنیادی تبدیلی آگئی یعنی اسلام کی تعلیمات اور پیغمبر اسلامؐ کی حیات طیبہ بلکہ اسلامی تہذیب کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہا جو ان مستشرقین کے متعصبانہ افکار کی زد میں نہ آگیا ہو، اسی دَور میں اسلام کی جو غلط تصویر یورپ والوں کے سامنے پیش کی گئی وہ مدتوں تک تاریخی حقیقت کے طور پر یورپ میں زبانِ زدرہی۔ اس دوسرے دَور کے بعد وہ دَور شروع ہوا جس کا تعلق یورپ کے صنعتی انقلاب سے ہے، یورپ کے اس صنعتی انقلاب نے ان کے اندر استعمار اور ملک گیری کی نئی ہوس کو ہوا دی، دولت اور اقتدار اور قبضہ کی اس ہوس کا نشانہ ظاہر ہے مسلم ممالک ہی تھے۔ ایسے میں اسلام کے لئے کھلا عناد اور دشمنی ظاہر ہے سیاسی مصلحتوں اور مفادات کے لئے مناسب نہیں تھی، اس لئے مسلمانوں کی تاریخ کے ایک ایک پیچ وخم، سماجی رجحانات اور دینی شعور کی فیاضی کی ضرورت تھی، نیا یورپ اس حقیقت سے واقف ہو چکا تھا کہ محکوم کے دل ودماغ تک پہنچے بغیر حکمرانی کی کوئی ساحری کامیاب نہیں ہوسکتی، چنانچہ مستشرقین نے اب اپنا رخ اور چہرہ بدلا اور کھلے عناد اور جنگ وجدل کی ظاہری علامات کی جگہ علمی اور فکری یلغار کی تیاری شروع ہوئی، عربی پڑھانے کا انتظام کیا گیا، اسلام کے علمی ذخائر کو جگہ جگہ سے سمیٹ کر لانے کے منصوبے بنائے گئے۔ اس سلسلے میں ایڈورڈ پوکاک، جارج سیل، ریسکے، بورہرڈ، سلوسٹر ڈی ساسی، ڈوزمی، رابرائن اسمتھ کے نام آتے ہیں، یہ وہ تمام مستشرقین ہیں جنہوں نے زہر کی تلخیوں کو تحقیق کے شہد میں اس طرح چھپایا کہ کام ودہن کو تو تلخی محسوس نہیں ہوئی لیکن زہر رگ وپے میں اتر گیا۔ یہ تیسرا دَور، دوسرے دَور سے بھی زیادہ سرگرم اور کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔

اس کے بعد ایک دَور وہ آیا جو یورپ کی استعماری ہوس کے کمزور ہونے کا دَور تھا جن ملکوں پر یورپ والوں کا قبضہ تھا وہاں آزادی کی تحریکوں نے غاصبین کا چین وآرام چھیننا شروع کردیا، یورپ کے شاطر دماغوں نے یہ حقیقت سمجھ لی کہ اب ان نوآبادیوں کی آزادی کو ٹالنا اور ان کو پہلے جیسا محکوم بنا کر رکھنا ممکن نہیں۔ لیکن سیاسی اقتدار اور صالح ومفاد کے لحاظ سے بالکل بے تعلق رہنا بھی ممکن ہے چنانچہ ہمارے ایک عالم کے بقول ''اب تمدنی رشتوں کی نئی زنجیریں وضع کرنے کے لئے اسلامی علوم کا نئے انداز سے مطالعہ ضروری ہوا۔ سیاسی مصلحتوں نے اس دَور کے مستشرقین کے لب ولہجہ کو اس طرح متاثر کیا کہ اب ان کی تحقیقی کاوشوں میں رنگِ احترام آگیا لیکن احترام کا یہ ڈھونگ ایسا نہیں تھا کہ اس کی حقیقت پر نگاہ نہ پڑ سکے۔ اہل فکر نے صاف دیکھا کہ اب ایسے فتنوں کو خاموشی سے بیدار کردینے کی جستجو شروع ہوگئی جن سے مسلمان ملک افتراق اور انتشار کا شکار بن جائیں اور ملی وحدت کی مضبوط رسی ان کے ہاتھوں سے چھوٹ جائے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد انگلینڈ میں ''اسکاربرو'' رپورٹ سامنے آئی جس کو محققین نے بجا طور پر استشراق جدید کے منشور سے تعبیر کیا۔ اس میں صاف طور پر اس حقیقت کا اظہار ہوا کہ نئے ابھرتے ہوئے مستشرق کو پوری طرح نہ سمجھا گیا تو

برطانوی مقاصد بری طرح متاثر ہوں گے۔ان برطانوی مقاصد کو نام بھی بڑا معصوم دیا گیا ''ورلڈ پیس'' امنِ عالم،لیکن بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی اس رپورٹ کے ایک ایک حرف سے سامراجی جذبات کے نئے چولے کے رنگ جھانک رہے تھے۔ایچ۔اے۔آر،گب نے ''ماڈرن ٹرینڈس اِن اسلام'' میں اسی انداز سے مسلمانوں کی نبض ٹٹولی۔

اس چوتھے دَور کے بعد وہ دَور شروع ہوا جس میں ہم آپ سانس لے رہے ہیں یعنی مسلمان ملکوں میں پیٹرول اور معدنیات کے نئے ذخائر کی دریافت کی وجہ سے ان ملکوں کی اقتصادی خوش حالی سامنے آئی تو یہ یورپ کے لئے تشویش بلکہ توحش کا سبب بن گئی،اب ان کی اصل فطرت سامنے آئی کہ اقتصادی اعتبار سے کیسے فائدہ اٹھایا جائے۔مستشرقین نے یہاں پھر اپنا انداز بدلا اب ان کی دلچسپی جدید مذہبی تحریکوں،سماجی رجحانوں اور اقتصادی امکانوں کی جانب منتقل ہوئی،اب فکر اسلامی کی توجیہہ وتعلیل سے زیادہ مسلمان ملکوں کے اندرونی اور بیرونی حالات کا تجزیہ ان کا سب سے بڑا موضوع بنا۔قومیت کے وہ عناصر جو وحدت ملی کے تصورات کو پارہ پارہ کر سکتے ہیں یہ ان مستشرقین کی توجہ کا مرکز بنے۔ یعنی اب پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ صہیونیت نے مستشرقین کے انداز تحقیق سے خاموشی سے ساز باز کر لی،ایریا اسٹڈی، سیاست ارضی اور عمرانیات ونفسیات کو اہمیت دے کر دینی عناصر کے مطالعہ سے گریز کیا جانے لگا۔اس دَور میں یورپ کے ساتھ امریکا بھی بلکہ وہی زیادہ نمایاں ہو کر اس طرح سامنے آیا کہ مشرق وسطیٰ کے مطالعات کے لئے کثرت سے مراکز قائم ہوئے اور ہر مرکز اسی خلش سے قائم ہوا کہ ہائیڈرپالی ٹیکس،اسلام اور نوآبادیات اور جدید تاریخ میں جہاد جیسے موضوع پر غور شروع ہوا اور اس طرح شروع ہوا کہ مستشرقین پہلی بار اس تذبذب میں مبتلا ہوئے کہ اسلامی فکر کا دھارا اب کس رخ بہے گا اور یہ کہ اب کہاں کہاں اور کس کس طرح بند بنایا جائے گا۔

مستشرقین کی اصطلاحی تاریخ کے یہ پانچ ابواب ہیں جن سے ان کی فکر،مقصد،منہج،محرکات اور محسوسات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے لیکن اگر اور غور سے دیکھا جائے تو یہ اصطلاحی تاریخ نامکمل ہے یہ تاریخ تو اسی روز سے شروع ہوتی ہے جب اسلام پہلی بار پیغام حق لے کر آیا اور مخالفت میں گو کفارِ قریش تھے لیکن ان سے بڑھ کر وہ یہود ونصاریٰ تھے جنہوں نے نسلی تعصب اور مذہبی عصبیت کی وجہ سے اسلام کو اپنے مقاصد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھ کر اسلام کا راستہ روکنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔قرآن مجید نے جب یہ کہا کہ: ﴿ وقال الذین کفروا لا تسمعوا لھذا القرآن والغوا فیہ لعلکم تغلبون ﴾ تو گویا یہ استشراق کی روح کا اظہار تھا۔

قرآن مجید کی یہ آیت کہ ﴿ وقالت طائفۃ من اھل الکتاب امنوا بالذی انزل علی الذین امنوا وجہ النھار واکفروا اخرہ لعلھم یرجعون ﴾ یا یہ کہ ﴿ ودوا لو تدھن فیدھنون ﴾ نے صاف بتایا کہ زمانہ نبوت کے یہود ونصاریٰ اور دَور کے مستشرق تھے اس لئے اس سلسلہ میں استشراق کے ادوار کی تقسیم کی ضرورت نہیں،ان کا جو رویہ اور رجحان اور نیت آج ہے وہ پہلے بھی تھی اس لئے مستشرقین کا نام ہو یا کوئی اور نام،ان کو پہچاننے میں کوتاہی ذرا بھی نہ کی

جائے، ہاں باقاعدہ جنگ وجدال، کبھی تحقیق کے نام پر تاریخی تلبیسات اور کبھی اسی تحقیق کو ''علمی تحقیق'' کا نام دے کر بظاہر معقول اور معروضی مباحث، صرف شکلیں بدلتی ہیں روح سب میں ایک۔ موجودہ دور ڈپلومیسی کا دور ہے۔ اس لئے لفظ مستشرقین کو بڑی معصومیت سے زبان سے ادا کیا جاتا ہے۔ ہمارے اکثر روشن مزاج اہل عقل ودانش بھی کہتے ہیں کہ اگر بیچارے مغربی اسکالر اور مفکرین مشرقی علوم وفنون کی تحصیل وتحقیق میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں، وقت ہی نہیں سرمایہ اور ذہنی صلاحیتیں بھی، وہ کام جو ہمیں کرنا چاہئے، بیچارے وہ کر رہے ہیں، کیا یہ ان کا احسان نہیں؟ لیکن یہ اہل دانش اپنی سطحی نظر سے اس دام کو نہیں دیکھ پاتے جو مستشرقین نے ان کے شکار کے لئے بچھائے۔

حکیم مشرق علامہ اقبال نے صحیح کہا تھا کہ ''جہاں تک اسلامی ریسرچ کا تعلق ہے، فرانس، جرمنی، انگلستان اور اٹلی کے یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے مقاصد خاص ہیں جن کو عالمانہ تحقیق اور احقاقِ حق کے ظاہری طلسم میں چھپایا جاتا ہے سادہ لوح مسلمان طالب علم طلسم میں گرفتار ہو کر گم راہ ہو جاتا ہے۔ اب اس سادہ لوحی کو کیا کہا جائے، محض مستشرقین کے ناموں سے مرعوب ہو جانے والوں کو بہت پہلے علامہ شبلی نے آگاہ کیا تھا کہ مستشرقین کتنے ہیں جو عربی زبان اور اصل مآخذ سے واقف نہیں، ان کا سرمایہ معلومات اوروں کی تصانیف، اور تراجم میں ان کا کام صرف یہ ہے کہ مشتبہ اور نامکمل کو قیاس اور میلانِ طبع کے قالب میں ڈھال کر دکھائیں۔

ایسے مستشرقین کو بھی جاننے کی ضرورت ہے، جو عربی زبان، علم وادب، تاریخ اور فلسفہ اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں لیکن مذہبی لٹریچر سیرت کے فن سے نا آشنا ہیں، وہ سیرت یا مذہب اسلام پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھتے لیکن ضمنی طور پر عربی دانی کے زعم میں اسلام یا شارع اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نہایت دیدہ دلیری سے جو کچھ چاہتے ہیں لکھ جاتے ہیں، مثلاً جرمنی کے ساخونے ''طبقات ابن سعد'' شائع کی تو اس کی وسعت معلومات اور عربی دانی سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن جب وہ اسلامی امور کے متعلق باتیں لکھتا ہے تو پڑھ کر بھول جانا پڑتا ہے کہ وہی محترم شخص ہے یا کوئی اور، نولڈیکی نے قرآن مجید کا خاص مطالعہ کیا ہے لیکن انسائیکلوپیڈیا میں قرآن پر اس کا جو آرٹیکل ہے، جا بجا صرف اس کے تعصب بلکہ اس کی جہالت کے راز پنہاں کی بھی پردہ داری کرتا ہے۔ ان مستشرقین کو بھی پہچاننے کی ضرورت ہے جن کی عربی دانی، کثرت مطالعہ اور تفحص کتب کا انکار نہیں لیکن جن کا حال یہ ہے کہ.....

دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوچتا کچھ بھی نہیں

جیسے مارگولیوتھ نے ''مسند احمد بن حنبل'' کی چھ ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہے اور کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا لیکن اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری پر جو کتاب لکھی ہے دنیا کی تاریخ اس سے زیادہ کوئی کتاب کذب، افتراء، تاویل اور تعصب کی مثال کے لئے پیش نہیں کر سکتی، اس کا کمال یہ ہے کہ جس میں برائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہو سکتا، یہ صرف اپنی طباعیہ کے زور سے بدمنظر بنا دیتا ہے۔ یہ وہ مستشرقین ہیں جن کا

سرمایہ استناد صرف تاریخ وسیر کی کتابیں ہیں۔ احادیث صحیحہ کے سرمایہ سے یہ یا تو بے خبر ہیں اور اگر کوئی ہے بھی تو فن کا ماہر نہیں اور بقول شبلی ہو بھی تو تعصب کی ایک چنگاری سیکڑوں خرمن معلومات کو جلانے کے لئے کافی ہے۔

علامہ شبلی نے اگر یہ اصول آج سے سو سال پہلے واضح کئے تھے تو مستشرقین کی علمی تحقیقات کی مرعوبیت سے نکلنے کے لئے یہی کافی تھے۔ ان کے شاگرد علامہ سید سلیمان ندوی نے ان ہی اصولوں کو سامنے رکھ کر کہا تھا کہ مستشرقین کی تحقیق وتدقیق سے جہاں فائدہ ہو رہا ہے، سخت نقصان بھی پہنچ رہا ہے، جس کی تلافی ہر مسلمان اہلِ علم کا فرض ہے۔ ان میں ایک ایسا گروہ بھی ہے جو اپنے مسیحی اور مغربی نقطہ نظر سے اسلامی علوم پر نظر ڈال کر تحقیق اور ریسرچ کے نام سے ایک نیا محاذِ جنگ بنا کر اسلامی، داعی اسلام، اسلامی علوم اور اسلامی تہذیب وتمدن پر بے پناہ حملے کر رہا ہے۔ قرآن مجید، حدیث، تصوف، سیر، رجال، کلام اور فقہ ان کی زد میں ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ یورپ کے اس رنگ کے لٹریچر سے اسلام کو کس قدر شدید نقصان پہنچا ہے اور پہنچے گا۔ اگر یہ زہر اسی طرح پھیلتا رہا اور اس کا تریاق تیار نہیں کیا گیا تو معلوم نہیں کس حد تک نوجوان مسلمانوں کے دماغوں میں سُمیّت سرایت کر جائے گی۔ شبلی وسلیمان بلکہ تحریک ندوۃ العلماء نے اس طبقہ کی فتنہ سامانیوں کا جس طرح سامنا کیا اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں۔ دارالمصنفین کے سیمینار اسلام اور مستشرقین میں جب مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے یہ آواز بلند کی تو اس کی تہہ میں اعتذار تھا، نہ معذرت نہ مرعوبیت بلکہ ایک اعتماد اور یقین اس آواز میں شامل تھا کہ مستشرقین کی ایک بیشتر تعداد نے اور کم سے کم اس تعداد نے ہمارے سامنے اور عالم اسلام کے سامنے جس کا تعارف ہوا ہے، اپنی خوردبین سے تاریخ اسلام، حدیث اور علوم اسلامیہ، تمدنِ اسلامی اور اسلامی حکومتوں میں صرف عیب ہی عیب دیکھا۔ اسلام میں جمال بھی ہے، کمال بھی ہے اور نوال بھی ہے مستشرقین نے ان تینوں چیزوں کو نظر انداز کر کے صرف معائب اور کمزور پہلو پیش کئے۔

مستشرقین نے کیا کیا اور ان کے مقاصد کیا تھے اوپر کی گفتگو میں اس کی ایک جھلک پیش کی گئی ہے۔ ان کے مقاصد بھی سامنے آگئے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ایک جگہ ان مستشرقین کے مقاصد کو اپنے انداز سے پیش کیا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ بڑی حد تک مستشرقین کے مقاصد کو جاننے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہم ان کا خلاصہ آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

افراد کی زندگی میں جو حیثیت حافظہ کی ہے قوموں کی زندگی میں وہی اہمیت ان کی تاریخ کی ہے، مستشرقین کے پیش نظر سب سے زیادہ اہم مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کا تعلق ان کی حیاتِ اجتماعی کے دینی، تمدنی اور فکری سرچشموں سے منقطع کیا جائے تاکہ جب وہ کسی انسانی کمال یا کارنامے کا تصور کریں تو ان کا ذہن مغرب کے سوا کسی دوسری طرف منتقل ہی نہ ہو سکے۔ بقول علامہ شبلی ”ہم کو صرف یہی رونا نہیں ہے کہ ہمارے زندوں کو یورپ کے زندوں نے مغلوب کر لیا ہے بلکہ یہ رونا بھی ہے کہ ہمارے مُردوں پر یورپ کے مُردوں نے فتح پالی ہے۔ یعنی مسلمانوں کو علمی

اعتبار سے ایسے احساس کمتری میں مبتلا کرنے کی کوشش کی گئی جس سے ان کی فکر کے سوتے خشک ہو جائیں، ان کی خودی ختم ہو تو ان کی گردنوں میں برگس اور ہیکل سے عقیدت کی زنار ڈال دی جائے۔ ایک مقصد یہ بھی تھا بلکہ ہے کہ مسلمان سائنس کی برتری تسلیم کر کے اپنے مذہب سے بے زار ہو جائیں، ان کو اپنا قانون، اپنی شریعت اپنا طرز زندگی سب فرسودہ اور بے کار نظر آنے لگے۔ مسلم پرسنل لا میں تبدیلی اور اصلاح کا آواز سب سے پہلے مستشرقین ہی نے بلند کیا تھا یورپ میں سائنس اور مذہب کا معرکہ جلدی شروع ہوا اور جلد ہی ختم ہو گیا لیکن مستشرقین نے مشرق میں اس جنگ کو طول دے کر مسلمانوں کو قدم قدم پر اپنے مذہب کے ناقص ہونے کا احساس دلایا۔ ایک مقصد یہ بھی سامنے آیا کہ مسلمانوں کے ذہن کو ایسے مسائل میں الجھا دیا جائے جن کا ان کی مکمل زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو لیکن جو قوائے ذہنی کو مضمحل کرنے میں کارگر ثابت ہو۔ اقبال کی نظم میں ابلیس جو بیشتر مسلمانوں کو ان گتھیوں کے سلجھانے کی تلقین کرتا ہے کہ

ابن مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے
ہیں صفاتِ حق، حق سے جدا یا عین ذات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
امت مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات
تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے
تابساط زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

تو اس میں مستشرق ہی کا دل دھڑکتا دکھائی دیتا ہے۔

ایک اور مقصد جو اہل فکر سے مخفی نہیں ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی تاریخ کے ایسے گوشوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر زیر بحث لایا جائے جو مسلمانوں میں اتحاد ملی کے جذبات کو نشو ونما پانے سے روک دیں، اس مقصد میں وہ کامیاب بھی ہوئے اور کتنی ہی عداوتیں جو وقت کے ساتھ بے جان ہو گئی تھیں ان کو نئی زندگی بخش دی۔ مستشرقین کے حالات، ان کی تحقیقات اور ان کے مقاصد کے متعلق یہ بہت ہی سرسری جائزہ ہے۔ دار المصنفین نے اسلام اور مستشرقین کے نام سے سات جلدوں میں ان کی ایک ایسی تاریخ پیش کر دی ہے جو اس سلسلہ میں کام کرنے والوں کے لئے بہت مفید ہے۔ زیادہ معلومات کے لئے ان کتابوں سے رجوع کیا جانا چاہئے اور ان سے یہ پیغام لینا چاہئے کہ

فرنگ سے بہت آگے ہے منزل مومن
قدم اٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں

☆☆☆